اداریہ

'ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے'

ادھر ایک مدت سے مشرقِ وسطیٰ کی مسلم اور عرب دُنیا ایک بحران سے گزر رہی ہے۔ یہ بحران اس وقت سے جاری ہے جب دُنیا کی دو بڑی متحارب طاقتیں، امریکہ اور آنجہانی سویت یونین مشرقِ وسطیٰ کو اپنے حلقۂ اثر میں لانے کے لیے سرگرمِ عمل تھیں۔ چنانچہ پاکستان، ایران، عراق اپنے 'روشن' مستقبل کی خاطر امریکی حلقۂ اثر میں آنے کے لیے بے قرار تھے۔ مصر میں مرحوم جمال عبدالناصر نے جواہر لال نہرو اور سیکارنو کے ساتھ مل کر غیر جانبداری کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا۔ وہ عالمی سٹیج پر دو متحارب طاقتوں سے اپنے خوشگوار تعلقات میں مصر کا بھلا دیکھ رہے تھے۔ لیکن مشرق و مغرب کی عالمی کشمکش میں پاکستان بہ وجوہ امریکہ کے ساتھ تھا۔ لیکن وقت نے بتایا کہ عالمی سیاست میں ہماری جانبداری یا مغرب دوستی ہمارے کسی کام نہ آئی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ ہماری داخلی کمزوری تھی، جس کی وجہ سے ہم اخلاقی اور جمہوری بنیادوں پر ایک صحت مند سیاسی اور اقتصادی نظام قائم کرنے میں یک قلم ناکام رہے۔ اگر ہم اپنی ساری سیاسی ناکامیوں کے باوجود ۱۹۷۱ء کے انتخابات کے نتائج کو کھلے دل سے قبول کر لیتے اور ملک کی اکثریتی پارٹی کے رہنما کو حکومت بنانے کی دعوت دیتے، تو شاید ہم ۱۹۷۱ء کے قومی المیہ سے بچ جاتے۔ ہماری سیاسی قیادت نے نہ تو کسی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا اور نہ ہی اپنے دوستوں کے صائب مشورے کو مانا۔ ایک باخبر حلقے کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے سے چند دن پہلے پاکستان میں امریکہ کے سفیر نے صدر جنرل محمد یحییٰ خان سے کہا تھا کہ

بھارت عنقریب پاکستان پر حملہ کر دے گا۔ اگر آپ کلکتہ سے مجیب الرحمان کے ساتھیوں کو واپس بلا کر اُن کی حکومت قائم کر دیں تو ڈھاکہ پر بھارتی حملہ رُک سکتا ہے۔ امریکن سفیر کی اس تجویز پر جنرل موصوف بھڑک اُٹھے اور کہا:

"I cannot talk to a traitor (شیخ مجیب الرحمٰن)."۔

پھر جو ہوا سو ہوا۔ کیا کوئی زبان یا قلم ۱۹۷۱ء کے المیہ کو بیان کر سکتی ہے؟

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

موجودہ پاکستان میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے وزارت بنائی۔ خدا نے انہیں بڑی فکری، سیاسی صلاحیتوں اور توانائیوں سے نوازا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے مقدور بھر بھارت سے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے کام کیا، جس کے نتیجہ میں شملہ معاہدہ وجود میں آیا۔ ہمارے ہزاروں قیدی واپس آئے۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ پاکستان میں جمہوری اور معاشی انصاف کی بنیادوں پر ایک سیاسی نظام قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی زرعی اصلاحات بھی جو ایک مثبت قدم تھا، بہ وجوہ ناکام رہیں۔ اس کی ایک بنیادی وجہ اُن کی سیاسی 'انانیت' (ego) تھی۔ جس کا شکار وہ خود اور ان کے ساتھی ہوئے، جنہوں نے پارٹی کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن کی حکومت کے خلاف مذہب کے مقدس نام پر جو تحریک چلائی گئی، وہ ایک 'سیاسی حماقت' یا 'سازش' تھی جس نے آگے چل کر اقبال و جناح کے سارے اخلاقی اور جمہوری افکار کو تہ و بالا کر دیا۔ جس سے معاشرے میں رشوت اور بدعنوانی کو فروغ ملا، آج زندگی عام شہریوں کے لیے ایک بوجھ بن گئی ہے۔ مہنگائی نے ان کی ساری خوشیاں چھین لی ہیں، کیا کوئی یہ سوچ سکتا تھا کہ مذہب کے مقدس نام پر نفرت، تشدد اور خون ریزی دیکھنے میں آئے گی۔ افلاطون نے سچ کہا تھا کہ ہماری ظاہری زندگی کی ژولیدگی اور بدنظمی دراصل ہماری معنوی ژولیدگیٔ فکر کا عکس ہے۔ چنانچہ اس فکری انتشار اور عملی بے راہ روی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہمیں ایک طویل اور کٹھن راہ پر چلنا ہوگا۔

اس لطیف نکتہ کو بیان کرتے ہوئے بیورج (Beveridge) نے کہا تھا: ''اگر انسان فطرت پر اپنے بڑھتے ہوئے اقتدار سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ وہ خود اپنے آپ پر قابو کیوں کر پائے؟ اپنے نفس پر قابو پانے کی اس جنگ کو جیتنے کے لیے لازم ہے کہ وہ اسی راہ پر چلے، جس پر چل کر اس نے فطرت پر برتری حاصل کی ہے۔ بیورج کا کہنا ہے کہ عمرانیات (Social Sciences) کے مطالعہ کی بنیاد تصورات نہیں، حقیقت پر ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر تہذیب کو خطرہ ہے۔ سوسائٹی اور انسان کی بہتر تفہیم کے بغیر بنی نوع انسان کے لیے یقینی مسرت کا حصول ممکن نہیں۔''[۱]

بیورج نے انسانی تہذیب کے لیے جس خطرے کی نشان دہی کی ہے، صدیوں پہلے پیغمبرِ اسلام (ﷺ) اور اُن کی امت کے اہلِ دانش اور اصحابِ معرفت نے برابر انسان کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اپنے اندر بیٹھے ہوئے خطرناک دشمن پر نظر رکھے اور اپنے نفس کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے خود اپنی گھات میں بیٹھے۔ بے شبہ انسان دوسرے کے دامن کے دھبوں کو تو دیکھنے میں بڑا ہوشیار واقع ہوا ہے لیکن اپنے دامن اور بندِ قبا کو دیکھنے کی اسے کبھی فرصت نہیں ملی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایشیا کی جو آزاد قومیں ہمارے ساتھ ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء میں آزاد ہوئی تھیں، وہ ایک وقت کے بعد نہ صرف اپنے ملک میں اقتصادی اور جمہوری نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں بلکہ ایشیا ہی کی دوسری قوموں کو منظم کرنے میں بھی کامیاب ہوئیں۔ آج ایشیا میں سنگاپور ایک جمہوری اقتصادی ملک کی حیثیت سے انتہائی کامیاب ملک شمار ہوتا ہے۔ اس کی نشاۃِ ثانیہ میں لی کون (Lee Kuan Yew) جیسے ''مسیح'' کا ہاتھ ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''سنگاپور (اپنی تعمیر نو میں) اسرائیل کا بہت ممنون ہے۔ جب ہم ۱۹۶۵ء میں آزاد ہوئے، مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل ہی وہ ملک تھا، جس نے ہماری شہری آرمی (Citizen Army) کے قیام میں ہماری مدد کی۔ ایک اسرائیلی کرنل جو اپنے دس افسروں کے ساتھ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۶ء تک سنگاپور میں رہا، جب وہ دوبارہ برگیڈیئر (Brigadier) کی حیثیت سے آیا، تو وہ ہماری اقتصادی ترقی

[۱] ڈاکٹر ایس، رادھا کرشنا، Speeches and Writings، دہلی، ۱۹۵۰ء، ص ۹۷۔

دیکھ کر کر حیران رہ گیا۔اور اس نے اپنے ملک اسرائیل کی اقتصادی ترقی کی سست روی پر افسوس کا اظہار کیا۔ تو میں نے اس سے کہا کہ ہم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن و آشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ نیز سنگاپور کی فوج ایک دفاعی فوج ہے جسے ہم کسی ملک کی مہم جوئی (Adventurism) کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اسرائیل کئی جنگوں میں مصروف رہا ہے۔'' [۱]

افسوس! پاکستانی قوم کو سکونِ قلب اور ایک سوچے سمجھے مربوط پروگرام کے ساتھ اپنی تعمیر و ترقی کے لیے موقع نہیں ملا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہم نے ۱۹۷۱ء کے المیہ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ جب ۱۹۷۹ء میں سویت یونین کی فوج افغانستان میں داخل ہوئی تو ہم امریکہ کی ہم نوائی میں جنگ میں شریک ہوئے اور اسے ''جہاد'' کا نام دیا۔ اس جنگ میں امریکہ نے دل کھول کر ہمیں مالی امداد اور جنگی اسلحہ سے نوازا اور پورا ملک جہاد جہاد کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ یہ مالی امداد ہمارے لیے ایک آزمائش تھی جس کا ہم ادراک نہ کر سکے۔ امام احمد بن حنبل کے سوانح میں ہے کہ جب امام عالی مقام نے خلیفۂ وقت مامون الرشید کے 'مذہبی' عقیدہ (قرآن مخلوق ہے) سے اختلاف کیا، تو انہیں سخت آزمائش سے واسطہ پڑا۔ لیکن اُن کی اولوالعزمی اور بلندنظری نے اس کا سامنا کیا۔ جب مامون کے جانشینوں نے اپنی روش کو بدلا اور امام موصوف کو مال و دولت سے نوازنا چاہا تو آپ نے اسے ٹھکرا دیا اور کہا: خدایا! مال و دولت کی یہ آزمائش، کوڑوں کی آزمائش سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہم نے امریکہ کی اشیرباد، اسلحہ اور ڈالروں کی مدد سے افغانستان پر سویت یونین کے جارحانہ حملے کے خلاف جو کردار ادا کیا وہ خود ہمارے اخلاقی اور سیاسی مستقبل کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ ہمیں اپنے روشن مستقبل کے لیے

[1] Foreign Affairs (Jan-February 2007), New York.

۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں خاکسار کو اپنے دو مصری ساتھیوں کے ساتھ کئی بار غزہ جانے کا اتفاق ہوا، تو عرب اسرائیلی سرحد پر بھی گئے۔ ایک طرف اسرائیل کی ایک انچ زمین خالی نہ تھی، اور ایک ہی طرز پر آباد بستیاں تھیں۔ دوسری طرف غزہ میں چٹیل میدان تھا۔ جب خاکسار نے ایک عرب شہری سے پوچھا کہ آپ کی سرزمین کیوں ویران پڑی ہے تو اس نے کہا، ''پہلے ہم اسرائیل سے نپٹ لیں، پھر یہ بھی کریں گے۔'' خاکسار نے کہا کہ درحقیقت معاملہ اس کے برعکس ہے۔

ایک سیاسی مدبر کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ ''مستقبل ان قوموں کے ہاتھ ہے جو پاک دامن ہیں۔''

صد افسوس! مسلم سرزمین میں امریکہ نے اپنا جھنڈا بلند کرنے کے لیے سوویت یونین کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔ دُنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس جنگ میں ماسکو اور واشنگٹن کے شہری تو امن وسکون کی فضا میں جیتے رہے لیکن مسلم سرزمین (افغانستان، پاکستان اور عراق) میں ایسی آگ لگی کہ آج تک بجھ نہیں پائی۔ پاکستان میں امن و آشتی کی جگہ ایک نئے کلچر نے لے لی۔ سوسائٹی میں تشدد کو فروغ ملا۔ کتنے ہی لوگ تشدد کا شکار ہوئے۔ دہشت گردی ایک خوف ناک درندے کی حیثیت سے ہماری سوسائٹی میں متعارف ہوگئی۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عراق میں صدر بش اور ٹونی بلیر جنگ ہار چکے ہیں۔ موجودہ تاریخ کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ صدر بش اور ٹونی بلیر نے عراق پر اپنے جارحانہ حملہ کا جواز دیتے ہوئے کہا تھا کہ عراق میں اینگلو امریکن فوجیں صدر صدام کے مہلک ہتھیاروں کو تباہ کرنے کے لیے بھیجی گئی ہیں۔ گویا آگ کو بجھانے کے لیے آگ لگائی گئی ہے۔ آنے والا مورخ صدر بش کے بارے میں کیا لکھے گا، اس کا ہمیں علم نہیں۔ لیکن آج بغداد میں اینگلو امریکن فوجوں نے جس بے دردی سے انسانی خون بہایا ہے، اس نے ثابت کر دیا ہے کہ اینگلو امریکن فوجیں صحیح معنی میں ہلاکو خان کی جاں نشین ہیں جس نے ۶۵۶ھ (تیرھویں صدی) میں بغداد کو بڑی بے رحمی سے تاراج کیا تھا، جس کا مرثیہ لکھتے ہوئے ابنِ اثیر اپنی معروف کتاب 'الکامل' میں لکھتا ہے: ''مَیں کئی سال تک اس ہولناک المیہ پر (سقوطِ بغداد) لکھنے سے گریز کرتا رہا اور آج بھی اس حادثہ پر لکھتے وقت تذبذب کا شکار ہوں۔ کون ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے اس المیہ پر لکھ سکے... کاش میری ماں نے مجھے جنم نہ دیا ہوتا، کاش! میں اس حادثہ سے پہلے ہی مر گیا ہوتا اور کوئی مجھے یاد نہ کرتا۔ مجھے چند دوستوں نے اس المیہ پر لکھنے کے لیے مجبور کیا اور کہا اس المیہ کا ذکر نہ کرنے میں کوئی فائدہ نہیں... یہ اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اب گردشِ لیل ونہار آئندہ اس قسم کا حادثہ جنم نہیں دے سکے گی۔''

ہم یہاں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ صدر بش اور برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر نے ادھر چند سالوں سے جو ہولناک جنگ شروع کر رکھی ہے، اس پر خود ان دونوں ملکوں کے اربابِ دانش اور لاکھوں شہریوں نے ان دونوں کی 'رسوائے زمانہ سیاست' کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ٹونی بلیر نے تو وزارتِ عظمٰی چھوڑنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ بش بھی 'غرقِ دریا' ہوا چاہتے ہیں۔

جن بدنصیب لوگوں نے ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں ہندو، مسلم، سکھ، فسادات کو دیکھا ہے، وہ آج تک اس ہولناک انسانی خون ریزی کو بھلا نہیں سکے۔ لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ہم حوادث کی گود میں پلنے کے باوجود اپنی اخلاقی اور سماجی زندگی کا محاسبہ کرنے میں ناکام رہے۔ اور ایک جمہوری فلاحی ریاست کا قیام خواب ہی رہا۔

موجودہ وقت میں پاکستان کو ایک جمہوری اور فلاحی ریاست بنانے میں ہمارے مدبر، دانش ور اور سنجیدہ سیاسی رہنما کسی بھی ایسے منصوبے کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ حال ہی میں ایک صدارتی مراسلہ میں پنجاب حکومت کو بتایا گیا ہے کہ پنجاب کی سماجی اور اجتماعی زندگی کس حد تک بیمار ہے۔ ہماری صدر موصوف سے اپیل ہے کہ وہ ایسے ہی ایک دوسرے صدارتی مراسلہ میں صوبائی حکومتوں سے دریافت فرمائیں کہ صدر محمد ایوب خان اور وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورِ حکومت میں جو زرعی اصلاحات جاری کی تھیں، وہ کس حد تک کامیاب رہیں؟ اور اگر ناکام رہیں تو اس کے کیا اسباب تھے؟ کیونکہ زرعی اصلاحات ہی پاکستان کو ایک فلاحی ریاست میں تبدیل کرنے میں ایک مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ہم ادھر ساٹھ سال سے ایک فلاحی، جمہوری اور اخلاقی ریاست کی تلاش میں ہیں۔ افسوس! ابھی تک ہمیں منزل نہیں ملی اور ہم اپنے بزرگ شہریوں کے لیے باوقار زندہ رہنے کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے کامیاب سیاسی تجربوں کے بعد بھی فرمایا تھا: ''آج مجھے جن امور کا پتہ چلا ہے۔ اگر پہلے ان کا علم ہو جاتا تو میں مالدار لوگوں سے اُن کی زائد دولت لے کر غریبوں پر تقسیم کر دیتا۔'' اسی طرح مصر میں اُن کے معروف مسلم گونر نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا: چار چیزوں سے بچو: مہمل

گفتگو سے (کثرۃ القیل والقال)، بڑے کنبہ سے (کثرۃ العیال)، مال و دولت کے ضیاع سے (ضیاع المال) اور وقت کو برباد کرنے سے (ضیاع الوقت)۔ دیکھیے کہ پیغمبر آخر الزمان نے اپنے بہادر ساتھیوں کی فطری صلاحیتوں کو بیدار کر کے ان کے رُخ کو بلند مقاصد کی طرف کیسے موڑا۔ ہمیں صدر موصوف کی متحرک شخصیت سے اُمید ہے کہ وہ پاکستان کو ایک فلاحی ریاست میں تبدیل کرنے کے لیے ٹھوس قدم اُٹھائیں گے، تاکہ سوسائٹی کے بزرگ شہری ایک باعزت زندگی بسر کر سکیں اور یہ تبھی ممکن ہے کہ پاکستان ایک فلاحی ریاست بنے، جہاں ملک کے بزرگ شہریوں کو پنشن کے ساتھ ساتھ مفت علاج کی سہولتیں بھی میسر ہوں۔ برطانیہ، ناروے، ڈنمارک، سویڈن کی فلاحی ریاستوں سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں زکوۃ فنڈ سے نادار خاندانوں کو جو امداد دی جا رہی ہے، اس کا ذکر عالمی بنک کی ایک رپورٹ میں بھی آیا ہے۔ پاکستان کے ایک ماہرِ معاشیات (ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی) نے لکھا ہے کہ اگر پاکستان میں ٹیکس وصول کرنے کا انتظام صحیح ہو جائے... تو ۲۰۰۶-۰۷ء میں ٹیکسوں کی مد میں ۸۳۵/ارب کی بجائے ۱۲۰۰/ارب وصول ہوتے۔ صرف ایک مالی سال میں ۳۶۵/ارب روپے کی اس اضافی رقم سے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' (روزنامہ جنگ، ۸ مارچ ۲۰۰۷ء)

یاد رہے کہ صدر موصوف نے ۲۲/فروری ۲۰۰۷ء کو اپنی جاری کردہ ہدایات میں کہا ہے کہ غریب عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ کم کیا جائے اور ٹیکس دہندگان کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ غرضیکہ پاکستان کو ایک فلاحی ریاست بنانے میں صدرِ محترم کی حکومت ایک تاریخی کردار ادا کر سکتی ہے۔ اگر اُنہوں نے اس راہ میں کوئی انقلابی قدم اُٹھایا تو منزل خود آگے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہے گی۔

قرآن مجید میں آیا ہے کہ ''جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں، ہم یقیناً اُن پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔ (عنکبوت:۶۹)

ع بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

رشید احمد (جالندھری)